

”ہم سب اسی ستارے میں رہتے تھے تمہیں اور پروین..... بہاں آنے سے پہلے“ ائمہ معلوم نہیں تھا کہ ایک بچے میں جب جلاوطنی کا احساس اچانک جاتا ہے تو اس کے دل پر کیا بیت جاتی ہے۔ ایک بار اس سے پہلے بھی میں نے ان سے ایک اور ممکن سوال کیا تھا اور سکول سے والبی پر پوچھا تھا۔ ”امی گزر گیا کیا ہوتا ہے؟ میری سیپیاں کہتی ہیں تمہارا باہر گزرا گیا ہے ...“

میری امی نے بڑے بھول پن سے کہا ”گزر گیا..... یعنی چلا گیا..... یہ دیکھو ایسے“ وہ ایک کرے سے دوسرے کرے میں چل گئیں۔ اور ان کے نزدیک یہ مسئلہ یہ یہ کے لئے حل ہو گیا۔ میری ماں کبھی سوال نہیں بتی ہی یہ جواب کی صورت میں زندہ رہنی ہیں۔ وہ کبھی نہیں پوچھتیں کہ یا الٰہی ستائیں برس کی عمر میں یہ وہ ہونے پر اتنی لمبی عمر تک کس کے سارے زندہ رہا جا سکتا ہے؟ اوکھے لوگوں کے ساتھ اوکھی اور کھلی باتوں میں الجھ کر انہیں تشنہ باتوں کے جواب نہیں چاہتیں۔ وہ جوانی سے بڑھاپے تک کاسفراپا ناول خود بہلا کر کاٹتی رہی ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنی اولاد سے یہ سوال نہیں کیا کہ تم لوگوں کے پاس میرے لئے کیا تھوا سا وقت بھی نہیں ہے؟ کیا تم میرے کسی کام، کسی مشغلو، کسی دلچسپی میں کبھی بھی شمولیت نہیں کر سکتے؟ وہ اس عمر میں بھی طفیلوں پر بنس سکتی ہیں۔ سکریبل کھیل کر، گانے گاتے ہوئے پچھوٹے پچھوٹے چھوٹے چھوٹے چھوٹے کے لئے ضرور ہے لئے نظمیں لکھ کر مسرور ہو جاتی ہیں۔ ان کی عبادت پھر گزاری، عرض گزارنے اور بھگڑنے کے لئے ضرور ہے لیکن وہ اللہ سے سوال نہیں پوچھتیں اس کا احصاب نہیں کرتیں۔ میری حالت ان سے بہت مختلف ہے میرے اندر سوالوں کی کھیپ بھکڑے اپولی بن کر اگتی رہتی ہے کچھ سوال خود بخوا جوابات میں ڈھل جاتے ہیں، لیکن جو کہنی فیک کر کھڑکی میں بیٹھ رہیں ان کے حل کی بھی ایک صورت کبھی نہ کبھی نکل آتی ہے۔

بچپن سے میں نے ایک عادت بنا لی ہے کہ جب کوئی سوال میری روح کو چھوڑ دتا ہے تو پھر میں یہ سوال کی سے نہیں پوچھتی۔ بس اسے اپنے اندر گرداب بنانے کے لئے چھوڑ دیتی ہوں پھر اچانک کہیں سے کسی طرح اس کا جواب مجھے آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ سن ۷۳ء میں جو سوال میں نے اپنے آبائی گھر کے متعلق اپنی امی سے پوچھا تھا اس کا جواب مجھے قدرت اللہ شاہب سے ملا..... لیکن وہ بھی اس وقت جب انہیں گزرے تین دن ہو چکے تھے۔

شاب صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کی بھی میں حراثت باتی نہیں رہی کیونکہ جو لوگ بیجے سے پودا پودے سے جھاڑ، بھاڑ سے درخت اور درخت سے جنادھاری چھترداری چھاؤں بن جاتے ہیں۔ ان کے متعلق درستی، سچائی اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ عموماً نارمل انسان کی زندگی مثل گھاس کے لئے ہے۔ سبزہ کھلا کبھی خشک ہا، کبھی ہرا..... لیکن محل بدلتا بدلتا کبھی لا رو اور کبھی تلئی نہ ہوا..... شاب بھالی جیسے لوگوں کو سمجھنا اس لئے بھی سل نہیں کہ گروہ تھے ایک مسلسل پروس سے ہے۔ پہلے انسان ایک کام کرتا ہے پھر اسے ترک کرتا ہے پھر دوسرا شروع کرتا ہے اسے بھی ترک کرتا ہے..... بعد ازاں ترک ترک کرتا ہے۔ جو لوگ ایسے شخص کو پہلی بیج میں

دیکھتے ہیں۔ ان کا تجربہ کچھ اور ہوتا ہے..... جو لوگ اسے دوسرے مرطے میں دیکھتے ہیں وہ کچھ اور رائے رکھتے ہیں۔ اور جو آخری عمدہ میں ساتھ ہوتے ہیں ان کامشناہیہ بالکل کچھ اور ہوتا ہے۔ جو شخص صرف لارواکی میکل کو جانتا ہے وہ کبھی بھی تخلی کو اسی لاروے کی تبدیل شدہ میکل نہیں سمجھ سکتا۔

ایسے لوگ جو گروہ کے پابند ہوتے ہیں۔ اور جن کے بیچ میں چھتراناری چھاؤں کا جراثم موجود ہوتا ہے ایسے لوگوں کے مغلن متفاہ آراء قائم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نظریات کی چھان پھٹک ہوتی رہتی ہے لیکن یہ فقط صاحب اختیار لوگوں کے اختیار کی باتیں ہیں۔ گھاس اس بات پر قادر نہیں ہوتی کہ وہ درخت بن جائے لیکن درخت اس بات کی گواہی ضرور دے گا کہ کبھی وہ گھاس کی صورت ہی درحتی سے نمو کے لئے نکلتا ہے۔

شاب صاحب کو سمجھنے میں بمحض پورے تیس سال لگے۔ جو سمجھ مجھے آج آئی ہے اس میں شک "ابام اور الحسن نہیں ہے پورا دلوقت ہے کیونکہ یقین کامل نے میرے لئے زندگی کو بت آسان بنادیا ہے" اور میں اسے الفاظ، عمل، نظریات یا علم کے حوالے سے نہیں بلکہ وجود ان کی راہ سے سمجھنے لگی ہوں جیسے انہیرے کمرے میں اچانک سورج کی کرن آجائے سے نہ صرف نظر آنے لگے بلکہ روح میں امید پیدا ہو جائے خوشی جنم لے اور جلا و طنی کا حساس جاتا رہے۔ ایسے ہی شاب صاحب میرے لئے روشنی کا سامان بنے۔

شاب صاحب اور عفت سے میری پہلی ملاقات میری شادی سے پہلے ہوئی تھی، لیکن یہ ملاقات مجھ پر اثر انداز اس لئے نہ ہوئی کہ میرا خیال تھا کہ میرے ہونے والے شوہر اپنی معتبری جتنے کے لئے اس بڑے افراد کو تھیا لائے ہیں۔ ہماری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی کہ میرے شوہر اشراق احمد گھر نذر کر دیئے گئے اور ہم نے اپنی زندگی چھڑے چھانڈ نگے بچپن آدرشون سے شروع کی..... ہمارے گھر میں سامان نہ تھا صرف آدرش ہی آورش تھے۔

اشراق احمد نے رسالہ داستان گو شروع کر دیا۔ یہ رسالہ خوبصورت تھا۔ پر سرمائے کی کمی کے باعث ذہب سے نہ نکلتا تھا۔ کبھی مینے کے شروع میں کبھی وسط میں کبھی دودو ماہ غائب..... عورت کے لئے آدرشون کی خاطر جینا اور مرتبا مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کا دام چھلانا یا لگاہے جو اسے ہر وقت دنیاوی ضرورتوں کے ساتھ باندھ رکھتا ہے۔ کبھی دودھ، کبھی بول، کبھی نوپی، کبھی یوٹ، کبھی بچے کی فیس..... کئی چھوٹے چھوٹے اخراجات ایک ساتھ جمع ہوں تو پچھہ پلتا ہے۔ ہزار مرتبہ نفیر بن کر عورت ہاتھ پھیلاتی دروے دروے سستی ہے تو ایک پچھے جوان ہوتا ہے۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے عورت کمینی، جھگرا لو، میکہ پرست، اور شوہر دشمن بن جاتی ہے.....

میں بھی ایک عورت تھی۔ اس وقت میری گود میں اینی خان اور انھیں خان تھے..... چونکہ بہت چھوٹے تھے اس لئے آدرشون کے کبل میں ان کو سرو دی لگتی تھی..... سمجھ بوجھ تھی نہیں۔ بغیر آسائش رفاقت کے معنی سمجھ میں نہ آتے تھے اور پھر ہر وقت کام ہی کام تھارفاقت کمیں تھی بھی نہیں۔ کبھی گھر کا کام کبھی رسالے کا کبھی

بچوں کا، زندگی کافی مشکل ہو گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ چوڑی دار پا جامد ہے، کانوں میں کان پھول سجا، سلیم شایی جوتی پہن، جب میں وارد ہوں گی تو اشراق احمد تالیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن اشراق احمد ہر انسان کے متعلق ایک خواب اپنے اندر چھپا کر رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ گر ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے کہ جس قدر فیضتہ فطرت نے اندر لپیٹ کر رکھا ہے کم از کم اتنا لذ ضرور نکل آئے جب میں اپنے بھائیوں امراءِ جان ادا بن کر موڑھے پر بیٹھتی تو اشراق احمد کامنہ کڑوا ہو جاتا وہ کہتے..... "قدیسہ! یہ عورت والے چونکلے چوڑ دو.....؟ میری ساتھی بن جاؤ..... میں گاندھی کافین نہیں ہوں لیکن اس کی پالیسی پر چل کر تمہیں اپنی ذات کا عرفان ملے گا..... کپڑوں کا سارانہ لو..... زیور کی مختابی نہ کرو..... لکھو..... محنت کرو..... رات دن کام کام..... اور پھر کام..... پھر تمہیں ایسی آزادی ملے گی جس کا کوئی بھی کچھ نہ بگاڑ سکے گا....." -

مجھے "کام کام کام" کی رث بری لگتی تھی لیکن مجبوری تھی وسائل اتنے کم تھے کہ میں اشراق احمد کے مقابل "عیش عیش عیش" کا نہ رہ نہ لگاسکتی۔ گردن جھکا کر، سلیپر پہن کر رکتی چلتی کام کی پسزی پر چڑھ گئی۔ ان دنوں جب ہمارا رسالہ "داستان گو" لنگری چال چال رہا تھا اور ادیب حضرات مضمون لکھنے کا دعہ کر کے پاس دعہ نہ کرتے تھے مجھے ضرورت نے ادیب بنادیا۔ اب جتنے صفحے کم پڑتے، مجھے افسانہ، مضمون، آپ ہی، ڈائری جانے کیا کچھ لکھنا پڑتا۔ ان ہی دنوں میں نے شکاریات پر "میر شکاری" کے نام سے کئی مضمون اور "موم کی کلیاں" کے عنوان سے ایک ناول لکھا۔ ضرورت ہی کے تحت ایک دن اشراق احمد نے مجھے کہا "قدیسہ تم شاہ صاحب پر مضمون لکھ دو....." اس بار شخصیت میں کچھ نہیں پہنچایں چپ ہو گئی۔

میں شاہ صاحب کو جانتی نہ تھی ان کے متعلق جو کچھ بھی خام مواد میرے پاس تھا وہ فقط شنید تھی۔ لیکن ایک بات نے مجھے خاکہ لکھنے پر اکسایا۔ میں نے تب تک یہ تجربہ حاصل کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی خان صاحب مجھے کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ چاہے کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو یہ شیعہ میرے فائدے ہی میں ہوتا ہے اس لئے میر شکاری کے مضمون کے ساتھ ساتھ میں نے قدرت اللہ شاہ پر جو کچھ لکھا وہ من و عن بیان کرتی ہوں، کیونکہ اس طرح آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آدمی کس قدر غلط اندازے لگاتا ہے کس قدر یوں قوی سے سوچتا ہے۔ انسانی ذہن یہ شیعی طرح تیرتا ہے۔ نیچے اتھاگہ گراہیوں میں جو سیپیاں موتی ہوتے ہیں بیٹھ کو ان کا علمی نہیں ہو پاتا۔ تمیں سال کی واقفیت کے بعد آج بھی میں اصلی شاہ صاحب کو نہیں جان پائی۔ میں صرف اس روشنی کو جانتی ہوں جو ان کی وجہ سے میری زندگی میں در آئی۔ یہ مضمون قریباً اٹھائیں سال پر اتا ہے جسے میں آپ کی نظر سے گزارنا ضروری بھیجنی ہوں.....

قدرت اللہ شہاب

ایک محفل میں پچھلے دنوں ایک نہایت طرحدار خاتون سے ملاقات ہوئی۔ اُنہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ حال ہی میں فرانس سے اپورٹ کی گئی ہیں۔ ان کا علم پاکستان کے متعلق ایسا ہی تھا جیسا عموماً سیاحوں کا ہوتا ہے انہوں نے جدید ترین فیشن پر بات کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ کس قسم کی تراش کے لباس میں عورت کے جسم کے لیے یہ عوب چھپ جاتے ہیں اور مل بوٹم پا جائے میں چال کس طرح سحر اگیز ہو جاتی ہے۔ جب فیشن پر سیر حاصل بحث ہو چکی تو آخر میں انہوں نے سوال کیا..... آپ کے ادب میں آج کل کون سافیشن مقبول عام ہے؟

چونکہ میری معلومات کم تھیں۔ اس کا سوال سن کر میں چکرا گئی اور جواب دیا۔ میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔ وہ کہنے لگیں کچھ دیر ترقی پندا ادب والوں کا بڑا ذر شور تھا۔ پھر کچھ دیر یہ غریل بڑی مقبول رہی، تیرا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا..... کبھی کبھی لوگ اچانک کسی مصنف کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں اور پھر ایک دن پتہ چلا ہے کہ وہ تواب ختم ہو چکے ہیں اور فلسفی دنیا سے مسلک ہو جانے کے بعد ان کی بات کرنا گویا ادبی ذوق کے فتدان کی دلیلی ہے یہ بتائیے آج کل ایسا جدید ترین وضع کا ادیب کون سا ہے؟ جس کو فیشن کہا جائے۔

میں نے حد بھری آہ بھری اور آہستہ سے کہا..... آج کل قدرت اللہ شہاب پر مضمون لکھنے اور لکھوانے کا فیشن ہے۔

فیشن میں ایک عیب بڑا جان لیوا ہے۔ اگر محض تقلید فیشن کیا جائے تو پیش انسان کوہن جاتا ہے نہ بڑی بوڑھیاں پسند کرتی ہیں اور نہ وہ مور زادیاں پسند کرتی ہیں جن کے پرچ اکر مور بننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیشن زدگی کے طور پر مضمون لکھنا تو قبول کر لیا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ میں شہاب کو اس طرح جانتی ہوں کہ جیسے کسی بڑی کوئی کے چھانک پر روز کسی بڑے آدمی کے نام کی محنتی سکوں سے آتے جاتے پڑھی ہو..... اس کے پھول کو آیا کے ساتھ لان میں پلاسٹک کی ٹیوب کے ساتھ نئے کپڑے بھگوتے دیکھا ہواں کی پورچ میں لبی لبی کاریں رکتی اور کھڑی ہوتی نظر سے گزرا ہوں۔ اس گھر سے نکلنے والے وردی پوش پیرے خانے سائیکلوں پر سے گزرتے و کھائی دینے ہوں پورچ سے ہفت برا آمدے میں کبھی کبھی خوبصورت کین کی کر سیوں پر ان دوست احباب کو بھی دیکھا ہو جاؤں گھر میں آتے رہتے ہوں لیکن جس نام کی محنتی باہر آؤ دیا ہے اس کے مسٹے سے کمل ناواقفیت ہو.....

جس انسان کے پاس ناقیت کی انڈکس موجود ہو، اس سے آپ یہ توقع نہ رکھئے کہ وہ آپ کو سیر حاصل قسم کا مضمون دے سکتا ہے نیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح عجائب گھروں میں گائیڈ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کہتا جاتا ہے یہ کانگڑہ سکول کی تصویر ہے اس میں سنبل زادی پنچا جبل رہی ہے۔ شیر کا شکار کھینے والا راجبوت ہے اور مرمر کے تخت پر پرا جہان سلیم چشمی رحمتہ اللہ ہیں۔ اور ان کے قدموں میں سورپنہوں کا بادشاہ ہاتھ میں لئے شیخو بابا بیٹھا ہے۔ یہ گندھارا سکول آف آرٹ ہے اور یہ بت بدھ کا ہے جب وہ کپل وستو سے لشیدد ہرا کو سوئی ہوئی چھوڑ کر جا رہا تھا..... یہ موہنجو داڑھ کے برتن ہیں۔ ان میں وہ لوگ گندم اور جو رکھتے تھے اور ان برتوں میں عورتیں اپنا زیور محفوظ کر کے رکھا کرتی تھیں۔ اب گائیڈ آگے آگے چلتا ہے..... ایک عنوان کو سورنگ سے باندھتا ہے اور آپ کی تحریر آنکھوں سے متوجہ رہتا ہے کہ اس کی ہر ہر بیات کو مکمل رسیرج اور شدھ علم پر محول کریں۔ میرا علم بھی گائیڈ کی طرح سنی سنائی پر زیادہ اور تحقیق پر کم منی ہے.....

میں آپ کے صحن ملن سے امید باندھ کر چلی ہوں کہ جو کچھ بھی شاہب صاحب پر لکھنے والی ہوں اسے کم از کم اسی دلچسپی سے سینیں جس دلچسپی سے آپ گائیڈ کی باتیں سناتے ہیں۔ کیونکہ شاہب صاحب بھی عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی ایسے مجسمے کی طرح ہیں جو آپ تو کم بولتے ہیں لیکن ان کے متعلق مختلف قسم کی باتیں زیادہ مشور ہو جاتی ہیں۔

شاہب صاحب سے میرا تعارف ہیشہ دوسروں کی وساطت سے ہوا۔ یوں مجھے چیزے علاوہ الدین کا تعارف پر منی سے آئینے کی سطح نے کروایا اسی طرح میرے اور شاہب صاحب کے درمیان کئی شفاف، کئی کھر درے، کئی اندرے، کئی دودھیا، کئی نوٹے ہوئے، کئی نہم اجلی نیم میلے، کئی تکون چوکور مدور، اور کئی محجب شیشے حائل ہیں۔

سب سے پہلے میں نے انہیں ایسی تین بنوں کی آنکھوں سے دیکھا جو اپنی اپنی جگہ شاہب کو اپنا بر تصور کرتی تھیں۔ بڑی نے جو ناک میں بولتی تھی مجھے کہا..... ”شاہب دراصل مجھ میں انظر پیشیدہ ہیں۔ وہ جب بھی بات کرتے ہیں۔ میری طرف ضرور دیکھتے ہیں۔ ڈیڈی سے باتیں کرتے کرتے وہ اوہ را درھر کچھ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ ان کی نظریں کس کو تلاش کرتی ہیں.....“

دوسری جو فنانہ آزاد کی پسمندی طرح بڑی عاشق طبع تھی اس نے مجھے بتایا..... ”شاہب جانتے ہیں کہ مجھے انہیں سے بڑا اور آتا ہے انہیں مجھے ذرا کر بہت مزا آتا ہے وہ جب بھی آتے ہیں رات گئے تک بیٹھے آسیب زدہ مکانوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ الی باتیں محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے منہ سے یہ باتیں سن

کر مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔

چھوٹی ازروئے انصاف تینوں میں سے بھلی اور بھگت فتح کی لڑکی تھی۔ چوکور ماتھے پر سیدھی مانگ اور سیدھی مانگ کے پیچے کھجوری چوٹی کرنے والی نے ایک روز مجھے بتایا تھا..... "آپ اور باتی تو نمایت خود پسند اتع ہوئی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک ادیب کیسا ہوتا ہے؟ شاب جب بھی آتے ہیں وہ دونوں آلتی پالتی مار کر ان کے گرد بیٹھ جاتی ہیں۔ کسی کو پروانہیں ہوتی کافی کب آئے گی..... سکوانش کون بنائے گا۔ کھانے کی میز پر پھول کون سجائے گا؟..... شاب منہ سے چاہے کچھ کہیں نہ کہیں گوہ ساری باتوں کا نوش لیتے ہیں۔ ادب جو ہوئے "۔

غایباً شاب صاحب مجموعی طور پر تینوں کا نوش لیتے تھے۔ اور علیحدہ انہیں کسی میں بھی دلچسپی نہیں تھی جس طرح وہنک کا کوئی خاص رنگ کسی کے لئے جاذب نہیں ہوتا اسی طرح اس سرگی قوس قزح کی ایک ملی جلی دلکشی تو تھی لیکن پلے نیلے اور لال میں تفریق مشکل تھی اسی لئے شاب صاحب ان لڑکوں کے بارے میں کسی مشتبہ نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔

ویسے مشتبہ نتائج پر پہنچنے والوں میں سے شاب صاحب نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں پر ایک جانب محدب اور دوسری جانب محبوب شیشہ پڑھا ہے۔ اسی لئے اس دروغ شیشے نے ان کی آنکھ میں میلی سکوپ کی سی خاصیت پیدا کر دی ہے اور وہ گالیلو گالیسی کی طرح ستاروں پر ایمان لے آئے ہیں۔ نتائج اخذ کرنے سے پہلے چند ما نے فضائیں تکتے ہیں اور پھر کرتے ہیں۔ "دیکھئے..... کیا ہو..... ہو سکتا ہے کہ شاید حالات یہ نہ رہیں۔ بہت ممکن ہے کہ..... میں نے ابھی کچھ اس بارے میں سوچا نہیں..... فی الحال کچھ سوچنا ایسا ضروری بھی نہیں"۔

شاب کے متعلق ان کے دوست "ان کی بیوی"، "ان کا پچھہ"، "ان کے ملازم"، "ان کے ماتحت"، "ان کے رشتہ دار بھی کوئی حقی رائے اس لئے نہیں رکھتے کیونکہ شاب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کبھی نہیں کرتے۔ ان دونوں کو کہیں لیں اور دھی کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق اتنی کمانیاں، اتنے نظریے اور الیکسی قیاس آرائیوں کا دفتر کھلا رہتا ہے۔

ان کے متعلق کچھ ایسی باتیں مشور ہیں جو نہ تو مکمل طور پر جمع ہیں اور نہ ہی جن کے بطلان کے لئے کوئی سکہ بند بھوت ہی ملتا ہے۔ ان افوہوں میں سے کچھ ایسی ہیں جنہوں نے شاب کو دلن میمنز، فرینک جیرس، اور رچڈ برشن کا ایک ملا جلا ہیوا بنا رکھا ہے۔ ایک افوہ ایسی سرگرمی ہے جس کی رو سے شاب شانی لاک ہیں ان کا ناطر ہر ہزار انگریزی سے ملتا ہے جس کے دبدبے سے پر تگالی ولندیزی اور انگریز قراقچی پناہ مانگتے تھے اس اعتبار سے وہ اصل کمرانی ہیں اور بجرے ڈونگے اور موڑبوٹ سے ان کو ازالی مناسبت ہے کچھ لوگوں کی زبانی یہ بھی سنا کہ شاب دراصل شاب نہیں ہیں۔ یہ تو سبز پوش سفید ریش

والے ایک ایسے بزرگ ہیں، جو بارہ دن الرشید کی طرح بھیس بدلت کر ایک ایسی دلائیت کا کام چلا رہے ہیں جس کا اس دنیا کے مخصوصوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں مُہیٰ شیخیش کا روپ دے رکھا ہے جو انقرہ سے ہانگ کانگ، ہانگ کانگ سے سنگاپور وہاں سے لاوس اور لاوس سے بدھا پٹت تک ایک ایسے خفیہ مشن پر رہتا ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔ چند یا نے لوگوں نے یہ بھی افواہ چلانی ہے کہ شاب دراصل منی کا ماد ہو ہے وہ اتنا ذرا ہیں، اتنا جاذب، اتنا پھر تیلا، اتنا کچھ بھی نہیں صرف اسے افواہوں کا شوق ہے اور ہر افواہ دراصل اس کی خود ساختہ ہوتی ہے۔ کسی سیانی ایکٹریس کی طرح۔ کون سی افواہ حق ہے اور کس حد تک حق ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس بات کا احساس ضرور ہے، کسی افواہ کی نفع کرتے ہوئے میں نے شاب صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور اس کی وجہ غالباً وہ نہیں جو آپ سمجھے ہیں وہ جو صرف اتنی ہے کہ ان کے نزدیک تروید کرنا غالباً ایک ثابت نتیجے پر چنچنے کے متراوف ہے اور نتائج اخذ کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

باضافتہ طور پر پہلی بار شاب سے میری ملاقات اشفاقي نے کروائی۔ اشفاقي کے یہ پہلے دوست تھے جنوں نے مجھ پر ایک بے دھیانی نظر بھی نہیں ڈالی۔ انہیں نہ میرے نفیاتی تحریبوں کی ضرورت تھی، نہ میری دل جوئی کی، نہ بھی میری مالی مدد کی۔ یوں جب پہلی بار میری شخصیت کی نفعی ہوئی اور میری خدمات کو فروعی سمجھا گیا تو میری بہت شیم شیم ہوئی اور میری اتنا نے یہ بد لہ لیا کہ چوری چوری شاب کے خلاف دل میں دیوار چین تعمیر کروادی اور جگہ بہ جگہ ایسے کیونوں کا پسہ بخداد یا جن کے ذمہ صرف ایک ہی کام تھا کہ شاب کے متعلق دیوار چین میں کہیں شکاف نہ آنے پائے۔ بھلاہو اس سشم کا کہ تماحال دیوار چین قائم ہے۔

اشفاقي اور شاب کی دوستی افریقہ کا وہ پھول ہے جو کلے من جارو کے پہاڑ پر آلتا ہے اور جو نبی کوئی ذی روح پاس آجائے معمولی پتے کی محل اختیار کر لیتا ہے۔ شاب اور اشفاقي لوگوں کے سامنے اجنبی ہیں۔ شاید تخلیکے میں بھی اجنبی ہوں لیکن لگتا ہے کہ احباب کا پتہ کاٹ کر جب وہ تھا ہوتے ہیں تو وہ اپنے اپنے سیف کی چاہیاں لگا کر وہ مال متاع ضرور ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں جنہیں انہوں نے عام نظر وہیں سے بچا کر ہا۔

پتہ کاٹنے سے مجھے یاد آیا کہ شروع شادی کے دن تھے جب پہلی بار شاب صاحب ایک شام سکن آباد میں ہمارے ہاں آئے۔ ان دنوں ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کا باہر والا نلکا سارا دن کھلارہ تھا۔ اور اندر کے نلکوں سے مستقل سوں سوں کی آواز آتی تھی۔ نلکے کی وجہ سے باہر کے دس فیٹے باغ میں کچھ تھا۔ شاب جب برآمدے تک پہنچنے تو ان کے بوٹ لشہرے ہوئے تھے۔ کمزور بھلکی کی روشنی میں یوں پر سے گارا جھاڑتے ہوئے انہوں نے اشفاقي سے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو

تھوڑی دیر جبکہ کے پاس بیٹھتے ہیں اور پھر..... میں اسے ساتھ لے جاؤں جی.....؟" میں نے گھبرا کر ہاں کہا دی۔

ان دونوں میرا سکھ وزنی تھا۔ اور ابھی حکمہ ازدواج میں اس کی ڈی ویوائشن نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتی تو شاب کے ساتھ اشفاق کو نہ جانے دیتی لیکن جب کرنی طاقتور ہوت کسی حکومت کو فکر نہیں ہوتا۔ سارے فکر تو اس وقت پڑتے ہیں جب اپنے روپیے کی قیمت یہ دون ماں کیث میں چار آنے رہ جاتی ہے۔

اس دن کے بعد شاب جب بھی آتے اشفاق کواغا کر کے لے جاتے با الفاظ دیگر میرا پتہ کاٹ دیا جاتا۔ میں زخم خورده دل میں سوچتی رہتی کہ وہ دن کب آئے گا جب شاب مجھ سے کیس گے "اشفاق کے لئے تو ہم مر گئے کبھی ملتا ہی نہیں۔ وہ بھی کیا دن تھے جب سارا سارا دن لارنس میں بیٹھے مانے کھایا کرتے تھے اسے تواب ہمارے لئے وقت ہی نہیں ملتا"۔

یہ لمحہ گوایمیرے لئے فتح میں کالج ہوتا۔ میں ان کافیاتی تجویز کرتے ہوئے کہتی "شاب بھائی آپ اشفاق کی محفلوں کو ترس نہیں رہے ہیں۔ آپ دراصل ایک خاص قسم کے کپلکس میں بنتا ہیں۔ آپ اپنی عمارتوں سے خوفزدہ ہیں..... آپ عید کے لئے عید کارڈ خریدنے سے گھبراتے ہیں۔ قلم کا پلاشاور سینچر کا آخری دن آپ کے لئے مملک ثابت ہو سکتا ہے..... آپ ذہنی طور پرور بندگو کے مرضیں ہیں"۔

لیکن اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ لمحہ نہیں آیا۔ میں اپنی جگہ فکر مند ہوں کہ کہیں میری یہ تمنا ناکر دہ حرثتوں کی فرست میں ہی شامل نہ ہو جائے اور مجھے ان کافیاتی تجویز کرنے کا موقع نہ ملے۔ دراصل شاب گل دوبیریا کا پھول ہیں اور میرا سپہر کی وہ لہڑی ہوں جب کوئی دوبیریا کا پھول کھلانے میں رہ سکتا۔ شاب وہ بچہ ہیں جس نے استانی کے چاک چڑا کر بنتے میں رکھے ہیں اور میں وہ مانیز ہوں جو استانی سے بھی زیادہ سُنگ دل ہے۔ میری اور ان کی شخصیت کی رقبیں اس طرح نہیں لکھی جاسکتیں کہ ان کے درمیان الجبرے کے برابر کی علامت آئکے۔ ہم جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں جیز بونڈزیر کے ایجمنٹوں کی طرح ان کا چڑہ واٹرپروف رہتا ہے وہ تبت کے لاماؤں کی طرح علیحدگی اختیار کئے رہتے ہیں اور ان سے ایسی برفلی ہوائیں آتی رہتی ہیں جیسے پانچ منٹ کے ایری کنڈیٹشنس سے بخستہ ہواؤں کا زوال ہو رہا ہو۔ اشفاق کی دساتیت سے جس شاب سے ملا قاتمیں ہوئیں، ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی وہ شاب گویا کسی انجمنی آدمی کا وہ کارڈ ہے جو وہ آپ کو یورپ کے سفر کے دوران درتا ہے اس سے آپ کو شرکی کسی خوبصورت بلڈنگ یا منظر کا تپہ چل جاتا ہے لیکن دیس والوں کی خبر نہیں ملتی.....

میرا خیال تھا کہ عفت کچھ دیس والوں کی خبر کھتی ہو گی اس لئے جب میں پہلی مرتبہ اپنے پھول

کے ساتھ شاب کے گھر پہنچی تو بڑی پر امید تھی۔ میرا خیال تھا کہ ان کی میز پر انسان کی شخصیت کی تیزی نہ بخود کھل جاتی ہیں۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ جو پوت شاب پر ہیں، وہ وروپی کی سائزی ہی کی طرح لامتناہی ہیں۔

تب شاب اور عفت کراچی میں رہتے تھے اور ان کی دو منزلہ کوٹھی باتحہ آئی لینڈ میں سندھ کی دلدل کے رخ پر تھی۔ پچھلائے کہیں ریل کی پسندی بھی تھی۔ جو غالباً پچھلائے نہیں بلکہ میرے ذہن میں کہیں بھی تھی اور رات گئے اس پسندی پر ریل گازی چھکا چک آیا کرتی تھی۔ باتحہ آئی لینڈ کے سارے قیام کے دوران مجھے صرف یہ علم ہوا کہ شاب کو کچھ بندہ ہے اور وہ ریڈ یو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ معلوم ہو کاتوہہ صرف اس قدر تھا کہ شاب کہیں جا رہے ہیں اور ان کا سامان پیک کرانے کے لئے کچھ پیکروں سے بات چیت ہو رہی ہے یہ بیکر کبھی کھو کھوں کی فرماںش کرتے تھے کبھی بات اور پھونس کی پر یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کیا کچھ پیک ہو چکا ہے اور کیا کچھ پیک ہو گا؟

اتھی بات طے ہے کہ ہماری آمد پر شاب صاحب نے نہایت احتیاط سے اندر والے خانوں میں اصلی شاب کو روئی کا گھومنسلہ بنا کر پیک کر دیا تھا۔ اسے اگر چو گا کھلا لیا جاتا تو ہماری غیر موجودگی میں، ہمارے سامنے تو ایک تھرموس نما شاب کھانے کی میز پر موجود ہوتے جن کے متعلق یہ فیصلہ نہ ہو سکتا کہ ان کے اندر بر ف کوٹ کر رکھی گئی ہے کہ ابتدی کافی..... کافی کا ذکر کرو تو مفتی جی کا نام لے بغیر بن نہیں آتی۔

اس کافی کے رسیا جگت گورونے ہماری زندگی کافی رنج کر رکھی ہے جن دونوں ہم باتحہ آئی لینڈ میں اپنے دونوں بچوں سمیت اپنا پہلا ہنی مون منانے گئے تھے۔ ان دونوں شومنی قسم سے ممتاز مفتی بندر روڈ پر ایک ایسے چوبارے پر مقیم تھے جس کے سامنے رات کے وقت کسی فلم کا اشتخار نہیں تیوں میں جگہا گا کرتا تھا۔ شہ نشیوں پر سے ٹریم چھوٹی سی بس نظر آتی تھی اور ہمسائے میں ایک ایسا سینما گھر تھا جس کے ریکارڈ اور پورے ڈائیلر اگ گھر بیٹھے نالی دیتے تھے۔

باتحہ آئی لینڈ میں اترے چوتھی شام تھی کہ اشفاق نے مجھے حکم دیا کہ مفتی صاحب کے گھر چلتا ہے کیونکہ وہ پہر سے بالکل باؤرن اور اندر سے نہایت دیالوس قسم کے کنفو جسٹ آدمی ہیں۔ یہ مفتی صاحب کے گھر میں شادی کے بعد میری پہلی رونمائی تھی۔ میں اور اشفاق جب کئی قسم کے چاہک، دروازے، زینے اور تختے گزر کر مفتی صاحب کے چوبارے پر پہنچو تو مفتی صاحب ایک لدے چندے کر کرے میں تخت پوش پر ایکھٹا کی گاروں میں چھپنی ہوئی اپسراوں کی طرح بیٹھے تھے۔ منہ میں حق کی نئی ہاتھ میں شترنچ کامہرہ تھا شہ نشیں میں بھابی اقبال کھڑی بسکٹ کھارہ تھیں اور تیل کے شوو پر کراچی جیسی جگہ میں تھا پیاس سگ رہی تھیں۔



”کون ہے؟.....“ مفتی صاحب نے اپنے بھانجے قیصر سے سوال کیا۔ جو بھانجبا بھتچا کم اور تھا نے دار زیادہ تھا۔

”ہم ہیں“ اشفاق نے اپنے مخصوص لمحے میں کہا۔

”ہم کون.....“

”اشفاق..... قدیسے.....“

اب مفتی صاحب کا رنگ آؤے میں سے نکلی ہوئی سرخ اینٹ جیسا ہو گیا۔

”میں نے سنا ہے تجھے کراچی آئے چاروں ہو گئے ہیں.....“

”یہ قدیسے بھی ساتھ ہے.....“ مجھے ڈھال کی طرح آگے بڑھاتے ہوئے اشفاق بولے۔

”کمال ٹھہرائے تو.....؟.....“

”باتھ آئی لینڈ میں.....“

”باتھ آئی لینڈ میں..... پر کمال؟.....“

اب اشفاق کبھی ایک پاؤں پر بوجھ تو لئے کبھی دوسرے پر۔ ان کی آواز میں یہی ایک خاصیت نہ رہی۔ تھی جس کی وجہ سے میں انہیں خان صاحب بلانے لگی تھی۔

”وہ جی باتھ آئی لینڈ میں..... قدیسے اور بچے بھی ساتھ ہیں۔ انہوں نے مدعا کیا تھا مفتی صاحب۔“

”کس نے مدعا کیا تھا تجھے؟۔ میرے سوائے؟..... ایسا اور کون ہے سارے کراچی میں؟.....“

مفتی جی نے اپنی ٹیکھی ناک کی سیدھہ پوچھا۔

”وہ اپنے شاہب صاحب ہیں ناں.....؟ تو نہیں جانتا شاہب کو..... شاہب رائٹر۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے انیسوں کو جاننے کی.....“

۔ فریب والے سینا گھر سے ملکہ پھر انے بڑی تنبیہہ بھری آواز میں گایا.....

”رب خیر کرے..... کیوں دل دھڑکے۔“ اس کے بعد بڑی مغلظہ گفتگو ہوئی۔ ایک ایسے مفتی

جی میں جو افراد کے خلاف تھا، ان کے چھوپن کے خلاف تھا اور ایک ایسے شوہر میں جو اپنی بیگم کو پہلی بار من چاہے دوست کے گھر لایا تھا۔ زیادہ گفتگو مفتی جی نے کی اشفاق نے کئی بار فلٹاپ کے طور پر کہا۔

”شاہب وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں آپ اسے مل کر تو دیکھئے.....“

”میں افراد سے کبھی نہیں ملتا..... ان کی ملاقاتیں تمہیں ہی مبارک ہوں.....“

”تجب آپ اس سے ملے نہیں تو پھر رائے کیوں دے رہے ہیں.....“

”اس لئے کہ ایسے بہت سے افراد کو میں جانتا ہوں۔ مگر مجھے کی جلد ہاتھی کا دماغ اور گیدڑ کا

غمیر.....“

اس رائے کے بعد میں نے کبھی متاز مفتی کے سامنے قدرت اللہ شاہب کا ذکر نہ کیا کیونکہ میں صلح کل قسم کی عورت ہوں اور مجھے سرگ بچانے کا کچھ ایسا شوق نہیں ہے۔ متاز مفتی بڑے خوبصورت خط لکھتے ہیں بلکہ یہں سمجھتے کہ خطوط میں بہت خوبصورت تاریخیت ہیں۔ باختہ آئی لینڈ کے واقع سے چند سال بعد اتفاقاً مفتی جی کا ایک طویل خط پنڈی سے ملا۔ بڑی خوبصورت انگریزی میں لکھا تھا..... میں اس کا ترجمہ پیش کرتی ہوں۔

صرف شفتر ہا اور قدیمہ جات کے لئے

گلتا ہے کہ وقت آگیا ہے۔ میں ایک اندازہ آدمی ہوں۔ میں دیکھ نہیں سکتا، سمجھ نہیں پاتا لیکن اندر ہے میں عموماً جذبات کی گمراہی پیدا ہو جاتی ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ فضائیں کچھ ہے میرے ارد گرد فضائیں مقناطیسی کشش ہے۔ یہ مقناطیسی دائرہ تمہارے دوست ستارہ کی وجہ سے ہے۔ یہ نام اسے ان لوگوں نے دیا ہے جو وثوق سے جانتے ہیں۔ یہ نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

(۱) چاند بر جتنا گھٹتا ہے لیکن ستارہ ہمیشہ جامد رہتا ہے۔

(۲) ستارہ ہمیشہ چاند کے ہمراہ رہ کر اسے راہ سمجھاتا ہے۔ ظاہر ہے جو نبی ہلال ذرا بھی بے راہ ہو ستارہ اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

گلتا ہے کہ ستارہ کے لئے بالآخری منزل ہے کہ وہ ہلال کو مشورہ دینے کے بجائے خود فعال ہو جائے۔ یہ آخری منعام کو پھر مندی کا نہیں بلکہ ذمہ داری اور خدمت کا ہے آخری مقام پر پہنچنے کے لئے "س" کو اپنا حالیہ عمدہ چھوڑنا پڑے گا۔ پھر وہ آخری مقام پر آسکے گا۔ اس وقت اس کے ارو گرد شفوا، قدیمہ جات، علی خان مفتی ہا ہوں گے..... وہ اپنی ساری خوشیاں بانشتا ہے لیکن اپنے غم سب سے پوشیدہ رکھتا..... وقت کم ہے.....

اس خط کے چند دن بعد پھر مفتی جی کا خط ملا۔

شفتر

ستارہ ۹ کو یہاں سے کراچی گیا۔ ۳ دن کراچی۔ ۳ دن ڈھاکہ، 'ایک دن لاہور،' انھارہ کو اپسی۔ ستارہ سے تمہارا مناضوری ہے خصوصی بات ہے سستی نہ کرنا.....

متاز

چونکہ اس تاریخ میں یہ وضاحت نہ کی گئی تھی کہ ستارہ کس ذات گرای کا نام ہے اس لئے ساری رات یہ تصفیہ کرتے گزرنی کہ اس نام کا اطلاق کس ذات شریف پر کریں۔ سلسلت کی بکری نما مرزا سے لے کر موقی بازار کے راجا صاحب تک سب کے نام کے ساتھ یہ لقب لگا کر دیکھا لیکن یہ دمار ستارہ کسی کی خصیت کے ساتھ فشنہ بیٹھا تو ہم مارے تجسس کے بھاگم بھاگ ایس پورٹ پر پہنچے۔

طیارہ پون گھنٹہ لیٹ تھا۔ لیکن ہم ستارہ کو دیکھنے کے اس قدر متنی تھے کہ وہیں جنے رہے۔

جماز سے جب سیر ہیاں لگیں اور بیضوی پھانک کھلا ایسہ ہوش کی صورت نظر آئے گئی تو ہم بچوں کی طرح جنگلے پر چڑھ گئے اور ہر آنے والے کو بنظر غازد کیھنے لگے۔ سب سواریاں ایسہ ہوش کو سلام کرتی اتر آئیں لیکن ستارہ طلو عنہ ہوا۔

حسنِ اتفاق سے ان ہی سواریوں میں ایک شاب بھی تھے جو نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں بریف

کیس جھلاتے تباہی سواریوں سے نظریں ہچاتے چلتے آرہے تھے۔

ابھی وہ اپنے سامان کی پرچیاں سی مٹول رہے تھے کہ ہم باہر نکلنے والے گیٹ پر جا پہنچے۔

”یار تیرے ساتھ کوئی ستارہ نای آدی تو نہیں آیا پندھی سے.....“

”ستارہ اتیاز کہ ستارہ قائدِ عظم.....؟“ شاب بھائی نے سوال کیا۔

اشفاق نے میری طرف دیکھا۔ مفتی صاحب یہ وضاحت کرنا بھول گئے تھے۔

”غائب ایسی توکوئی بات نہیں لکھی مفتی نے۔ مفتی کا کوئی دوست تھا جماز پر؟.....“

اشفاق نے پھر لوپھا ”میں مفتی کو ہی بہت کم جانتا ہوں اس کے دوستوں کو کیسے پوچان سکتا ہوں؟.....“ شاب بولے۔

اشفاق کی تشویش دیکھ کر شاب بھائی بڑی محبت سے بولے ”کام کیا ہے؟.....“ ”کام تو نہیں ہے صرف مفتی صاحب کا حکم ہے اور ان کافر بان نادر شاہی ہو اکرتا ہے۔“ اب شاب کے لئے نادر موقعہ آیا۔ وہ دوسروں کے احکامات کی اہمیت کو گھٹا کر بست خوش ہوتے ہیں۔

جھٹ بولے ”میں سُرچاچی کاسفر گول کرتا ہوں۔“ تم مفتی صاحب کے ستدارے کو گول کرو۔ اور قدیسہ کو غالباً بچوں کی یاد ستاری ہو گی اسے گھر بھین دیتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو.....“

”لیکن جی ہمیں تو یہاں سے اماں جی کے گھر جانا ہے مرنگ روڈ.....“ میں نے اپنی زندگی پڑھنے دیکھ کر

کہا۔

دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اشفاق کے چہرے پر مظلومیت چھا گئی۔

”ہاں یار..... اماں جی کے جانا تھا مجھے تو..... وہاں بخشش خال سے بوریاں آئی ہیں گندم کی، اگر دو

چار دن، ہم نہ گئے تو ساری گندم اماں جی بانٹ دیں گی ادھرا دھر.....“ گندم تو ریڑھے پر جائے گی.....

قدیمہ کو مرنگ چھوڑ جاتے ہیں وہاں سے داتا صاحب چلیں گے ”۔

داتا صاحب کے نام پر میں مراجعت نہ کر سکی۔

چند دن بعد پنڈی سے ایک اور تاریخی صورت میں آیا۔

مارانی!

کل میں نے خواب دیکھا تھا۔

ستارہ خواب میں تھا۔

اس کے ہاتھ میں گڑھل کا پھول بھی تھا۔

ساری باتیں پیچی ہیں۔

بھائی جان بھی کی کتے ہیں۔

مفتش

پسلے تو معہد حل ہونے کی کوئی صورت تھی لیکن اب تو کافکا کی کمانی میں اینڈرائیں پوکھی شامل ہو گیا۔ ستارہ کی گواہی بھائی جان نامی کوئی غیر معروف ہستی دینے لگی اور ساری باتیں گڑھل کے پھول سمیت خواب کی تھیں اس لئے ہم جو خواب سے باہر تھے ہکا لکا رہے گئے۔ میں نے اور اشفاق نے غصے میں فوراً خط لکھا کہ یہ ستارہ کھانے میں ہے، پینے میں؟ استعمال کی چیز ہے کہ سجاوٹ کی؟ اکیس سوالوں کے اندر بوجھی جا سکتی ہے کہ اس کے لئے کوئی راستے والی چیتیاں ایجاد ہوئی ہے؟۔ اس مدل انکوارری پر یہ خط موصول ہوا۔

مارانی!

شلغم کا چار مسٹ بھگوانا میں خود آ رہا ہوں۔

رنگ..... رنگ رنگ

ستارہ کل شام ملا تھا۔ رات گئے تک اشفاق کی باتیں ہوتی رہیں۔

مفتش

اس خط سے ستارہ نامی اندر گرا اؤنڈ آدمی کا پتہ نہ چلا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مفتش کے اکلوتے بیٹے عکسی پر این دنوں پیننگ کا بھوت سوار ہے اور طبلے بجائے کی شیع نکل گئی ہے۔

یہ معہد تو ایک عرصہ نہ کھلا لیکن ایک دن اچانک مرزا صاحب آگئے۔ مرزا صاحب جو سلمت کی

بکری کی طرح بے ضرر چھوٹے سے پیارے سے ہیں اور جنیں ہم عام طور پر مرزا آف کویت کے نام سے یاد کرتے ہیں، بمبئی ناکیز کے کامیڈین وی۔ اسچ۔ ڈیساٹی کے ہم شلیل ہیں اور یہک وقت حاضروں غائب رہنے کافی جانتے ہیں۔ ان کی زبانی اشراق کے دوستوں پر تبصرہ سن کر عجائب لطف ملتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت حد اور فرا خدیل کاشکار رہتے ہیں۔

”کل شام مفتی ملا تھا۔ مفتی ازادے حرامزادہ..... کیوں بیٹھا دیسی.....؟“

”ابھی میں قدمیں نہیں کر سکی اس بات کی مرزا صاحب.....“

چھوٹی سی انگشت شادت اٹھا کر مرزا صاحب آف کویت ہنسنے ہیں اور پھر چھوٹی چھوٹی آنکھیں اشراق کی طرف موڑ کر کہتے ہیں، ”یار یہ تیری یہوی کھری ہے کھری.....؟“

”اچھا مرزا جو وہ پنڈی کا کیا حال ہے، عمر کیا ہے؟ راجا صاحب کا کیا حال ہے؟“

”سب ٹھیک ہیں حرامزادے..... یار وہ قدرت اللہ شاہ کیا چیز ہے؟.....؟“

”چیز؟..... آدمی ہے وہ تو.....؟.....“ اشراق نے کہا

”آدمی.....؟ اس کو آدمی کہتے ہو؟..... بلڈی راسکل.....؟“

”زبان سنھال کربات کر مرزا..... بلڈی راسکل ہو گا تو.....؟“

”تیرے لئے تو وہ ایک بست مفید اور اونچا افسر ہے بیٹا بھوگو.....“ مرزا جی بولے لیکن یہک دم مرزا کا چھوٹا سا چڑھا اور چھوٹا ہو گیا.....

”یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تمہیں اور مفتی کو.....؟“

”کیا ہو گیا ہے.....؟“

”ادھراس حرامزادے مفتی کی زبان سوکھتی ہے ستارہ ستارہ کہتے۔ ادھر تو کچھ بھرن مپھسن قسم کا ہو گیا ہے ذرا سی بات سن کر.....؟“

مرزا صاحب سے کم از کم اتنی بات ضرور معلوم ہو گئی کہ جس بچے کی تلاش سارے ایز پورٹ پر تھی وہ بچا لکل بغل میں کھڑا سماں کی پرچی تلاش کر رہا تھا۔ نام کے معلوم ہوتے ہی اشراق نے شاہ کے متعلق ایک بست تفصیلی خط مفتی صاحب کو لکھا جس میں بار بار ستارہ کا لفظ استعمال کیا اور یوں ملشی والوں کی طرح ایبل ڈوگ چارلی شوگر قسم کی ایک اصطلاح ہمارا کوڈ بن گئی۔

جمان تک شاہ کے لقب اختیار کرنے کا تعلق تھا، سب خوش تھے۔ لیکن اب جو مفتی صاحب نے اس نام کے تحت شاہ کی شخصیت میں اولیا کئے کرام کی صفات سے مستعار لے کر پھول پیاں لگانا شروع کر دیں تو تم سے برداشت نہ ہو سکا۔ سارے احکامات مفتی جی کی طرف سے آنے لگے اور ہم نے علاقائی حکومتوں کی طرح ان حکم ناموں پر خالص قسم کی عدم مطابقت کا عمدہ کر لیا۔

مفتی جی کا خط آیا۔

سوارانی!

اشارہ ہوا ہے

میری تنواہ کا کیس کبھی ملے نہیں ہو سکتا۔
میں مطمئن ہوں۔

مفتی

مفتی کا بغیر تنواہ کے رہنا ہمارے لئے ایک بڑی اذیت کا باعث تھا لیکن اشارہ جو ہو چکا تھا اس لئے
ہم بھی مطمئن ہو گئے۔
پھر خط ملا۔

سوارانی!

عکسی سی ایس پی نہیں کرے گا۔
ستارہ نے کہا ہے اسی میں بہتری ہے۔

مفتی

عکسی کو سی ایس پی ضرور کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس طرح ہمارے ملنے والوں میں ایک ڈی سی لڑکے کا اضافہ
ہو جاتا، اور ہم جب اس کے علاقے میں جاتے تو ہماری بہت آؤ بھگت ہوتی اور چونکہ ہمیں عزت کروانے
کا بہت شوق ہے اور یہ شوق اسی طور پر اہو سکتا تھا اگر علاقہ بہ علاقہ ڈی۔ سی صاحبان سے واقفیت ہو۔
لیکن مفتی جی نے اس خواب پر بھی بہتری کی چیلی چادر چڑھادی.....
پھر خط ملا.....

سوارانی!

سارے جسم پر پھوٹے نکلے ہیں۔
سخت عذاب میں ہوں کوئی دوام موافق نہیں آتی۔
ستارہ آیا تھا۔ کہنے لگا الرجی ہے۔ علاج چھوڑ دو۔
اب علاج کے بغیر صاحب فراش ہوں۔

جسمانی تکلیف ہے، ذہنی نہیں.....

مشقی

مفتی جی کے ان خطوط نے رفتہ رفتہ شہاب کی صورت بگزے ہوئے مجھ موعود کی کر دی۔ جو تھوڑا بت امکان انہیں جانتے کا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پچھے ہوئے لوگوں میں دعیب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگوں میں رہ کر اللہ کو بیاد کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ مشدشہ لاحق رہتا ہے کہ آپ کی پتہ نہیں کون سی رپورٹ اور پر کر دیں۔ دوسرے یہ کہ عموماً اللہ اپنے پیاروں کو آزمائے کا شوقین ہے اور ہم دونوں آزمائش سے بہت ڈرتے ہیں اگر اللہ کے چنیدہ لوگوں کے پاس رہے تو کون جانے کب آئے کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔

شہاب کی جو تھوڑی بت محبت اشراق سے ملی تھی اسے مفتی جی کی عقیدت کھا گئی اور اس طرح یہ تعارف اس آئینی تعارف تک محدود رہا جو علاوہ الدین کا پدم منی سے ہوا تھا۔
اس تعارف میں دو شگاف موجود ہیں۔

ایک شگاف میں جی کی ذات تھی اور دوسرا شگاف ناقب ہے۔

مجھے ماں جی سے وہ ملاقات اب بھی یاد ہے جب ہم کراچی سے لاہور کا سفر کر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا، صحرائی رات کی ننکی تھی۔ ماں جی کو غالباً اسی سردی کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ کھڑکی سے پشت لگائے تسبیح پھیر رہی تھیں۔

”قدیسہ“ ادھر میری سیٹ پر اپنا کا کاؤال دے، دو بنچے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں، کروٹ لے کر کوئی پچھے نہ آگرے۔“

”ٹھیک ہیں ماں جی، آپ فکرنا کریں“

”مجھے تو نیند نہیں آرہی، اینیق کو ادھر ڈال دے میری سیٹ پر“۔

”ماں جی“ ان کا کیا اعتبار۔ سوبے میں آپ کا بستر نہ بھگو دیں کہیں۔“

”ادھر آمیرے پاس قدیسہ.....“

میں ماں جی کے پاس جائیں گے۔

”جس عورت کے پنگ پر بچہ پیش آپ نہ کرے، وہ عورت بد نصیب ہوتی ہے۔“

”جی ماں جی.....“

”و عاکر میرے شہاب کے گھر بھی بیٹھا ہو۔“ ماں جی بولیں۔ ”اس کا بستر بھگونے والا بھی جلدی آئے۔“

”ضرور ہو گام جی.....“

”میرے شاپ میں ایک خوبی ہے وہ جو کچھ بھی مانگتا ہے دوسروں کے لئے مانگتا ہے۔ میں جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں اپنوں کے لئے کچھ نہ کچھ مانگتی ہوں۔ یہ فرق ہے..... اس میں اور مجھ میں.....“

میں چپ رہی۔

”شاپ کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا وہ نہیں ہے قدیسہ.....“

”جی ماں جی.....“

”ایقون کو میرے بستر پر ڈال دے قدیسہ، دوپنچھے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں.....“

ماں جی نے وہ فرق نہ سمجھا یا جلوگوں کے سمجھنے اور اصلی شاپ میں تھا۔

وہ دعا جو ماں جی اپنے لئے مانگا کرتی تھیں وہ شاپ کے بینی ٹاقب کے وجود میں پوری ہوئی۔ ٹاقب کی تین آنکھیں اور اس کا گول گول وجود بھی ایک ایسے شاپ کی نشاندہی کرتا ہے جو ہمیشہ نہ ہوں سے اچھل رہا۔

ٹاقب جب کسی آئے ہوئے مہمان کی طرف اشارہ کر کے عفت سے پوچھتا ہے ”ای یہ کب جائیں گے؟“ تو مجھے اس میں شاپ کی بیزاری نظر آتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسلے اویب بنا یا پھر ایک ایسی نوکری پر مامور کیا جو بے سود فائیلوں پر دستخط کرنے کے سوا ہے اور کچھ نہیں۔ ضرورت مندوں کا ایک ایسا جھلکھلا ان کے گرد قائم کر دیا جو پشاور کے بالا حصار سے بھی مضبوط ہے۔ اتنے سفران کی قست میں لکھ دیئے کہ اس سکون کا فندان ہو گیا جو بزرگوں کی میراث ہوتی ہے۔

یکھو شاپ نے اسی بیزاری پر بھلی سی مسکراہٹ اور برداری کا غلاف چڑھا رکھا ہے۔ اور اس غلاف کے علاوہ ایک اور غلاف بھی ہے جس میں شاپ نے اپنی گذری اور بنسری بھی چھپا رکھی ہے۔ جب کبھی ان کی پرواہ بہت اونچی ہو جاتی ہے وہ اپنے چڑھانے میں اترتے ہیں۔ بو سیدہ غلاف کھونی سے اتراتے ہیں اور اس بنسری اور گذری کو نظر بھر دیکھتے ہیں۔ پھر تاج سلطانی اور بدہہ قآنی باتی نہیں رہتا اور زمین پر ننگے پاؤں چلنے والوں سے محبت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ شاپ کا سارا تخلی، مٹھاں برداری اسی پوتیں اور بنسری کی زیارت میں چھپی ہے۔ ورنہ لارنس میں بیٹھ کر گندزیر یاں کھانا، سوریوں کے تانکے میں نکسالی سے لاہوری گیٹ تک سیر کرنے جانا، لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر بابی جنی کا تھیز دیکھنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔ اور پھر ان کی شخصیت میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکتی جو نیک اور بد پر لیبل نہیں لگاتی اور دوسروں کی کمزوریوں کو اپنی ترقی کا زیر نہیں بناتی جو چشم پوشی کرتی ہے اور بھول جاتی ہے اپنے احسان بھی



عفت شہاب

Scanned By Waqar A

اور دوسروں کی احسان فراموشی بھی۔

احسان کرنے اور احسان فراموش کرنے والوں کو بھول جانے میں عفت شاہب کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہی وہ پل ہے جو ان دونوں کناروں کے درمیان بوڈاپسٹ کے پل کی طرح ایتادہ ہے اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملاتا ہے۔

عفت شاہب کے ساتھ ساتھ رہتی ہے بالکل جس طرح پی آئی اے کا طیارہ دھرتی کے ساتھ ساتھ پلاتا ہے۔ وہ شاہب کو اسی نظر سے دیکھتی ہے جس طرح ہواںی جہاز کی بیرونی کھڑکی سے دھرتی کا منظر نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے، چوکور مستطیل کھیتوں کے ٹکڑے، ماچس کی ڈیبوں کے ڈھیر جیسے شر، لکنکھبور سے سے پہاڑ اور سرے کی لکیری سڑکیں۔ آسمان کی بلندی سے دھرتی کا ایک سارنگ ہوتا ہے۔ ہلکے نیل رنگ میں لپٹا ہوا خاکستری رنگ..... مشرقی انسان کارنگ۔ عفت کبھی شاہب کا تجربی نہیں کرتی۔ وہ شاہب کو بدلت کر ایک اور شاہب بنانا نہیں چاہتی۔ اس نے کبھی اس دھرتی رنگے آدمی کے شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کو دور میں لگا کر نہیں دیکھا۔ وہ اس نیالے مشرقی آدمی کا ایک ملا جلا رنگ دیکھتی ہے اور اس رنگ پر اس لئے اعتماد کرتی ہے کہ اس رنگ سے روئیدگی کا پیام ملتا ہے۔ اس سے رحم کی خوشبو آتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک رات جب شاہب نوپی پارک میں مقیم تھے میں ان کے گھر گئی تھی۔ اکتوبر کا آغاز تھا۔ ان کے پچھے بر آمدے میں جہاں مکان سے قدرتی ڈھلوان شروع ہو کر دور وادی تک کامنظر نظر آتا تھا۔ اسی بر آمدے میں رات گئے تک میں اور عفت بیٹھے شاہب کا منتظر کرتے رہے۔ بالآخر عفت نے کہا..... ”ایک ہی آدمی میں اتنی صبر آزمائھیتیں نہیں ہونا چاہئیں۔ انسان اس کے ساتھ دستار تا تھک جاتا ہے.....“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی.....“ میں نے پوچھا..... عفت نے لمبی سانس لی اور بولی ”در اصل شاہب قصور وار ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر غصہ اس نے نہیں آسکتا کہ قصور وار ہونے کے باوجود قصور ان کی ذات کو ملوث نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے غافل ہوتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ مجھ سے غافل ہیں۔ ایسے آدمی کو کوئی کیا کہ جس کا ہر بہار میں اہر گھڑی میں ایک سارنگ رہتا ہے۔“ ایسے آدمی کی شاید ایک ہی خوبی ہو اکرتی ہے۔ اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اور عفت شاہب پر اعتماد کرتی ہے جس طرح کسی زمانے میں جیسیں کے لوگ اپنی دیوار پر بھروسہ کرتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرا شاہب سے ابھی تک تعارف نہیں ہے۔ میں نے تو نقطہ فیش کے تحت مضمون لکھنا قبول کر لیا تھا۔